Tarjihaat
Volume: 11
Issue: IX
September 2022
ستمبر ۲۰۲۲
آن لائن ادبی رسالہ
ترجیحات
ISSN: 2583-0082

ڈاکٹر محمد توحید خان
ہندستانی زبانوں کا مرکز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو ناول کے معمار مرزا ہادی رسواؔ

اردو اصناف نثر کے ارتقا کی تاریخ پر غور کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو نثر کی کئی اصناف ظہور پذیر ہوتی ہیں اور سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتی ہیں۔ جبکہ دیگر اصناف کے ارتقا کو دیکھیں تو اس کی ایک طویل تاریخ ملتی ہے۔ دراصل ادب میں اظہار و ابلاغ کے پیرائے اور ہیئتیں ملک کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی عوامل کے سبب نمو پذیر ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کی نصف آخر ہندستان میں تبدیلیوں کا دور تھا۔ ملک میں تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی مسائل غیر ملکی تسلط کے سبب سامنے آتے ہیں۔ جہاں زندگی کے دیگر شعبہ جات میں کرب و انتشار نظر آتا ہے اور ان کے سد باب کی کوششیں ہوتی ہیں وہیں ادب میں بھی ان مسائل کی ترجمانی کے لیے نئے نئے پیرائے سامنے آتے ہیں۔ انھیں پیرایوں اور اصناف میں ناول کی ایک صنف ہے جس نے زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی کی اسی لیے اس صنف کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ناول دراصل وہ صنف نثر ہے جس میں زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ مکمل طور پر پیش کی جاتی ہے اور جس میں ماحول اور معاشرے کے نشیب و فراز اور تبدیلیوں کا خاکہ ہوتا ہے۔ یعنی ناول اپنے دور کی تہذیبی اقدار کی کشمکش کا رزمیہ ہوتا ہے اور ان اقدار و حقائق کی پیش کش میں ناول نگار اپنے تخیل کے ذریعے 'قصہ پن' کا رنگ گھول کر اسے اپنے قارئین کے لیے دلچسپ بناتا ہے۔

اردو ناول نگاری کا دور (۱۸۵۷ء) کے انقلاب کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان پر جب انگریزوں کا پورا تسلط قایم ہو گیا تو ان کی تہذیب معاشرت نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ جدید علوم و فنون اور نئے تہذیبی نظام نے نہ صرف ہندوستانی معاشرت کی فرسودہ اور بے بنیاد روایتوں پر کاری ضرب لگائی، بلکہ ہندوستانیوں کو زندگی اور زمانے کی نئی قدروں کا احساس بھی دلایا۔ ان تبدیلیوں کا براہ راست اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا۔ اب داستانوں کا طلسم رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگا۔ تخیلی اور بے بنیاد فکر کا تانا بانا کمزور پڑا "کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ" کا فلسفہ مدھم پڑتا چلا گیا۔ اسی دور میں سرسید احمد خاںؔ، حالیؔ، شبلیؔ، ذکاء اللہ وغیرہ نے اصلاح سماج کے ساتھ ساتھ اصلاح ادب کو بھی لازمی جانا۔ انہی حضرات میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے جنھوں نے حقیقت پر مبنی کہانیاں لکھ کر معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی اور اس طرح ہمارے یہاں اردو ناول کا آغاز ہوا۔ گرچہ نذیر احمد کی کہانیوں کو بعض ناقدین مکمل طور پر ناول کے زمرے میں رکھنے کو تیار نہیں لیکن یہ داستان کی خواب

Tarjihaat
Volume: II
Issue: IX
September 2022
ستمبر ۲۰۲۲
آن لائن ادبی رسالہ
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
WORLD URDU RESEARCH & PUBLICATION CENTRE
WURNP

آگیں فضا سے پہلی بار بغاوت کی کوشش تھی یا یہ کہیے کہ اردو قصہ نگاری میں ایک نئی روش کی شروعات تھی اس لیے اس ابتدائی کوشش کو ناول کی خام شکل قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح انگریزی میں رچرڈسن کی تخلیق ''پامیلا'' سے ناول نگاری کا آغاز ہوا اسی طرح اردو میں نذیر آحمد کے ''مراۃ العروس''، ''توبۃ النصوح''، ''بنات النعش''، ''ابن الوقت'' اور ''یامی'' جیسے ناول،اردو ناول کا نقطہ آغاز کہے جا سکتے ہیں۔

نذیر آحمد نے ان تمام ناولوں کو طبقۂ نسواں کی اصلاح کے لیے لکھا تھا اس لیے ان میں فنی چابکدستی کی بجائے واعظانہ ثقالت وطوالت پائی جاتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان میں کردار بھی بے حد میکانیکی نداز کے ہیں خواہ وہ اصغری ہو یا اکبری، نصوح ہو یا ابن الوقت، یہ سب کردار بالکل مٹی کے بادھو نظر آتے ہیں۔نذیر آحمد نے اپنے کردار کو یا تو خوبیوں کا پیکر یا محض خامیوں کا پتلا بنا کر پیش کیا ہے، حالانکہ انسان تو خیر و شر کا پتلا ہوتا ہے۔ محض اچھا ہونا یا صرف برا ہونا یکسر غیر فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود نذیر آحمد کا یہ کارنامہ کہ انہوں نے داستان نگاری کے طلسم سے نکل کر ناول کی داغ بیل ڈالی،تاریخی اہمیت کے لحاظ سے نا قابل فراموش ہے اور اس اعتبار سے انہیں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں خشت اول کا مقام حاصل ہو جاتا ہے
۔

نذیر آحمد کے بعد اردو ناول نگاری میں دوسرا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا آتا ہے۔ان کی تصانیف میں ''فسانۂ آزاد''، ''سیر کہسار''، ''جام سرشار'' اور ''کامنی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سرشار کے یہاں وہ سنجیدگی اور متانت مفقود ہے جو نذیر آحمد کے ناولوں میں ملتی ہے۔ سرشار کے یہاں ایک آزادی کی فضا ہے،ان کی کہانیوں میں داستانی رنگ وآہنگ نمایاں ہے۔انہوں نے لکھنوی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت اور بول چال سے بخوبی واقف ہیں۔اس لیے پلاٹ کے ڈھیلے پن کے باوجود ان کی تحریر میں ایک کشش ہے، زبان کا لطف ہے اور لکھنؤ کی جیتی جاگتی تصویر نمایاں ہے۔ لیکن ان کے بیشتر ناولوں میں پلاٹ بے ربط اور ڈھیلے ڈھالے ہیں اور ایک سرگذشت کی صورت نظر آتی ہے۔چونکہ ان کے ہاں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بے قاعدگی اور بے ربطی ہے اس لیے ان کے کرداروں میں بھی استقلال نہیں ملتا۔ وہ وقتی اور ہنگامی ضرورتوں کے مطابق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ سرشار کے یہاں جذبات نگاری کا بھی فقدان ہے۔ وہ ظرافت نگاری کے ماہر ہیں۔درد و غم کی تصویر کشی ان کے بس سے باہر ہے۔ان کے یہاں افراد قصہ کی اس قدر کثرت اور واقعات کی اتنی فراوانی ہے کہ ان کی بنائی ہوئی تمام تصویریں آپس میں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ان کی تحریروں میں یک رنگی سی ملتی ہے۔ان کے پلاٹ، کردار اور زبان وغیرہ میں ملتی جلتی ایک ہی طرح کی بات نظر آتی ہے۔تاہم سرشار نے خصوصاً آزاد اور خوجی کے دو انتہائی جان دار کردار تراشے ہیں، یہ دونوں بالترتیب لکھنؤ کی ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی تہذیب کے انتہائی جان دار مرقعے ہیں۔ چنانچہ سرشار کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے خیالی اور بے بنیاد قصہ نگاری کے بجائے حقیقی اور واقعی حالات و واقعات کو اپنا موضوع بنایا اور اپنی کہانیوں کے لیے معاشرتی فضا اور زندہ انسانوں کو منتخب کیا ہے، اس لیے ان کا نام اردو ناول نگاری کے ایک معمار کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے۔

Tarjihaat
Volume: 1I
Issue: IX
September 2022
ستمبر ۲۰۲۲
آن لائن ادبی رسالہ
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
WORLD URDU RESEARCH & PUBLICATION CENTRE
WURNP

اردو ناول نگاری میں سرشارؔ کے بعد عبدالحلیم سرشارؔ بھی کئی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں۔انہوں نے گرچہ اصلاحی اور سماجی ناول بھی لکھے ہیں لیکن ان کی پہچان دراصل تاریخی ناول نویسی کی بنا پر ہوئی۔شررؔ نے اسلام کے تاریخی واقعات کو اپنا سر چشمہ بنایا اور عروجِ اسلام کا نقشہ،آباءواجداد کی فتوحات وغیرہ کو اپنے تاریخی ناولوں میں بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔لیکن وفورِ جذبات میں انہوں نے اکثر تاریخی حقائق کو مسخ کردیا ہے۔ان کے ناولوں کے اکثر کردار بھی بے جان نظر آتے ہیں۔ان کرداروں کے نام تو عربی ہوتے ہیں مگر اپنے مزاج و خواص کے اعتبار سے یہ کردار ہندوستانی ہیں۔شررؔ کے ہیرو،ہیروئن عام طور پر ایک قسم کے ہوتے ہیں۔انفرادیت جو کرداروں کا خاصہ ہوتی ہے،شررؔ کے یہاں مفقود ہے۔شررؔ اپنے ناولوں میں انسانی فطرت کا لحاظ بھی نہیں رکھتے۔ان کا مسلم ہیرو تنہا دس دس مخالفوں پر بھاری پڑتا نظر آتا ہے۔شررؔ کے کرداروں کے مکالمے بھی کوئی خاص تاثر نہیں رکھتے۔نفسیاتِ انسانی سے بھی شررؔ کو کوئی خاص سروکار نہیں،کیونکہ ان کے بیشتر ہیرو حسن و جمال میں یکتا اور فرشتہ خصلت نظر آتے ہیں اور یہی یکسانیت ان کے کرداروں کو غیر فطری،بے اثر اور بے جان بنا کر رکھ دیتی ہے۔لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود اردو ناول نگاری میں شررؔ ایک اہم مقام اس سبب سے رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں پلاٹ کو بڑے منطقی ربط کے ساتھ برتا ہے۔ناول نگاری کے باب میں بیانیہ انداز کا رواج بھی انہیں کی دین ہے۔منظر نگاری میں بھی انہیں کمال حاصل ہے اور پھر اردو میں تاریخی ناول نگاری کے تو وہ موجد بھی ہیں۔شررؔ کے ناولوں کی فہرست کافی طویل ہے لیکن جو خاص اہمیت کے حامل ہیں ان میں ''فردوس بریں''،''فلورا فلورنڈا''،''منصور موہنا''،''ملک العزیز ورجینا''،''حسن انجلینا''،''ایام عرب زوال بغداد''،فتح اندلس''وغیرہ ہیں۔

فن کے اعتبار سے اس وقت تک اردو ناول نگاری میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی۔بس انگریزی ناول نگاری کے نقش قدم پر چلنے کی ایک کوشش تھی۔یہ سچ ہے کہ نذیرؔ احمد،سرشارؔ اور شررؔ کی بدولت اردو کہانیاں،داستان گوئی کے دائرے سے نکل کر زندگی اور سماج سے ہم آہنگ ہوئیں۔لیکن نذیرؔ احمد نے اپنی زیادہ تر توجہ عورتوں اور مذہبی اصلاح پسندی پر مرکوز رکھی۔عام دلچسپی اور شگفتگی ان کے یہاں مفقود ہے۔ان کے ناولوں پر اصلاحی اور مقصدی رنگ اس قدر غالب ہے کہ اکثر وہ اپنے مقصد کو واضح کرنے کی خاطر فن کا خون کر جاتے ہیں۔گویا نذیرؔ احمد کے یہاں فن سے زیادہ مقصدیت کو اہمیت دی گئی ہے۔سرشارؔ نے مزاح اور شگفتگی کا عنصر ضرور پیدا کیا،کردار نگاری کی طرف بھی توجہ دی،لیکن ان کے پلاٹ میں تسلسل اور ربط پیدا نہ ہو سکا اور نہ کوئی خاص مقصد نمایاں ہو سکا۔شررؔ نے اپنے ناولوں میں ماضی کو زندہ کرنا چاہا لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی ان کے کرداروں کی انفرادیت نمایاں ہو سکی۔گویا ناول کے فن کو اس کی مکمل اسپرٹ کے ساتھ پوری کامیابی کے ساتھ ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں برت سکا تاہم اپنے دور کی حدود میں رہتے ہوئے شاید یہ لوگ ناول کے میدان میں اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔آگے چل کر مرزا محمد ہادی رسواؔ نے اس جانب توجہ دی اور شعوری طور پر اردو ناول کو فنی اوصاف کا حامل بنانے کی کوشش کی۔

مرزا رسوآ کا زمانہ متضاد کیفیات کا حامل تھا۔ دو تہذیبی قدریں شکست وریخت کے عمل سے گذر رہی تھیں۔ ملکی تہذیب نزاعی کیفیت سے دوچار تھی اور مغربی تہذیب اپنی تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نموپذیر ہو رہی تھی۔ یہ زمانہ سیاسی، تہذیبی، معاشی ، سماجی اور ادبی، ہر لحاظ سے بحرانی تھا اور عبوری بھی۔ سلاطین و نوابین اور عام لوگ سب کے سب معاشی زبوں حالی کے شکار تھے ۔ رسوآ کی آنکھوں نے انہیں بھی دیکھا تھا جو کبھی صاحب تخت وتاج ہوتے تھے اور انہیں بھی جو بعد میں بھیک مانگنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ اپنے زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مرزا رسوآ لکھتے ہیں:

"یہ شریف گردی کا زمانہ ہے اور اپنے ہاتھوں کسی قسم کی تعلیم نہیں، اچھی صحبت نہیں پھر بنے تو کیوں بنے۔ انہیں بھیک مانگنے والوں میں وہ لوگ ہیں جن کے بزرگ بر سر حکومت تھے ا۔"

غرض اس سیاسی، سماجی اور معاشی انتشار، افراتفری اور اضمحلال سے لوگوں میں ذہنی بے اطمینانی اور فرار کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے "ناول لکھنے کے لیے ایک سنجیدہ شعور اور خیال کی ایک گہرائی اور گیرائی ضروری ہے ۲۔" اس اعتبار سے مرزا رسوآ کے ناولوں میں نہ صرف موضوع اور مواد کے تجربے ملتے ہیں بلکہ ان میں تمام فنی لوازم کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے، جو رسوآ کے احساس اور باشعور ہونے کا پتہ دیتا ہے۔

مرزا رسوآ ایک جدت پسند طبیعت، گہرے شعور، باریک میں نگاہ اور شدید قوت مشاہدہ کے مالک تھے۔ شعر وادب کے علاوہ انہیں ریاضی اور فلسفے سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ چونکہ اس زمانے میں نفسیات کو فلسفے کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا اس لیے فلسفے کے ساتھ ساتھ رسوآ کو منطق اور نفسیات سے بھی دلچسپی تھی۔ انہی علوم کے زیر اثر رسوآ کے ذہن اور شعور کی نشوونما ہوئی تھی لہٰذا حقیقت بینی اور استدلال ان کے انداز فکر کا جزو بن گئے تھے۔ اسی انداز فکر سے انہیں ناول نگاری میں بڑی مدد ملی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کو اپنایا اور اپنے عہد کی ترجمانی بڑے فنکارانہ انداز میں کی۔ غالباً اسی وجہ سے رسوآ نے اپنے ناولوں کو اپنے زمانے کی تاریخ کہہ کر پکارا ہے ۳۔

مرزا رسوآ ناول کے فن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح اصلاح کے علم بردار تھے نہ سر شار کی طرح محض ظرافت کے رسیا تھے اور نہ شرر کی طرح ماضی کے پرستار تھے۔ وہ سب سے پہلے ایک فن کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فنی شعور اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہے۔

ماجرا نگاری یا پلاٹ کی تعمیر میں رسوآ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کسی نے کہا ہے کہ پلاٹ کی تنظیم ایک فلسفیانہ عمل ہے۔ اردو ناول نگاری میں اس قول پر مرزا رسوآ بالکل پورے اترے ہیں۔ غالباً اس میں اس طبعی لگاؤ کا بھی دخل ہے جو انہیں فلسفے سے تھا۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ توازن و تناسب، ہم آہنگی اور تنوع کے لحاظ سے نہایت مربوط اور گٹھے ہوئے ہیں۔ وہ قصے اور واقعات کو اس سلیقے کے ساتھ ترتیب دیتے ہیں کہ کہیں بھی ان کے پلاٹ میں ڈھیلا پن یا جھول نظر نہیں آتا۔ صرف دو ایک ناولوں میں جہاں انہوں نے مقصدیت کو زیادہ ابھارنے کی کوشش کی ہے وہاں کچھ ناکام ہوئے ہیں۔ ایسی صورت "شریف زادہ" اور "اختری بیگم" میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس "امراؤ جان ادا" اور "اختری بیگم" میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے بر

Tarjihaat
Volume: 11
Issue: IX
September 2022
ستمبر ۲۰۲۲
آن لائن ادبی رسالہ
ترجیحات
ISSN: 2583-0082
WORLD URDU RESEARCH & PUBLICATION CENTRE
WURNP

عکس ’’امراؤ جان ادا‘‘ اور ’’ذات شریف‘‘ میں ان کے پلاٹ ہر لحاظ سے متوازن اور مربوط نظر آتے ہیں۔ پلاٹ کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں خود مرزا رسوا کا درج ذیل قول ان کی فنی بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔ وہ ناول میں پلاٹ سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’بعض معاصرین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ کسی امر خاص کے ثابت کرنے کے لیے پلاٹ بناتے ہیں اور اس کی مناسبت سے خانہ پری کرتے ہیں۔۔۔۔ ہمارا طرز تحریر اس کے برعکس ہے۔ ہم صرف اصل واقعے کو ہو بہو دکھانا چاہتے ہیں ۴۔‘‘

اور یہ سچ ہے کہ مرزا رسوا کا یہ فنی رکھ رکھاؤ عام طور پر مقصدیت سے مجروح نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مقصدیت کو اس فنی سلیقے سے پیش کیا ہے کہ ان کے پلاٹ بے ربط اور غیر متوازن نظر نہیں آتے۔ پلاٹ سازی کی انہی خوبیوں کی بنا پر ناقدین ادب نے انہیں اردو کا فیلڈ نگ (FIELDING) کہہ کر پکارا ہے۔

پلاٹ کی خوبصورت ساخت اور تعمیر و تشکیل کے بعد مرزا رسوا کی کردار نگاری پر فنی لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو ان کے کمال فن کی داد دینی پڑتی ہے۔ انہوں نے کرداروں کو حتی المقدور حقیقی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے زیادہ تر کردار لکھنوی ہی کی دین ہیں اس لیے ماحول اور معاشرے سے مکمل واقفیت کی بنا پر رسوا نے اپنے کرداروں کی تخلیق میں نہایت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ ان کا ہر کردار نمایاں، جاندار اور اپنے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتا ہے۔ گرچہ مرزا رسوا سے قبل پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کردار نگاری میں اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور ان کے کردار بھی سرزمین لکھنو ہی سے وابستہ ہیں، لیکن سرشار اپنے کرداروں کی روح میں نہیں اتر پاتے، نہ ان کی نفسیات پر اپنی گرفت رکھ پاتے ہیں اور نہ ان میں سنجیدگی اور استقلال پیدا کر پاتے ہیں، بلکہ وہ انہیں محض شوخی اور ظرافت کا پیکر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرشار کے چند کرداروں کو چھوڑ کر بیشتر کردار غیر مبسوط، غیر فطری اور یک طرفہ نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد اور شرر بھی مرزا رسوا کے پیش روؤں میں ہیں۔ لیکن ان دونوں کے یہاں بھی کردار نگاری کا کوئی خاص کمالِ فن نظر نہیں آتا۔ ان دونوں نے اپنے ناولوں میں عام طور پر مثالی کردار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تینوں کے برعکس مرزا رسوا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف فطری اور حقیقی کردار نگاری کی بلکہ اپنے کرداروں کے احساسات، جذبات اور نفسیات کو بھی پوری طرح پیش کیا اور اس طرح اردو ادب میں نفسیاتی کردار نگاری کی نئی روش کا آغاز کیا۔ رسوا اپنے ناولوں میں مختلف فطرت کے دو کرداروں کو پیش کر کے ان کی نفسیات اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً ’’امراؤ جان ادا‘‘ میں امراؤ جان اور بسم اللہ جان، ’’اختری بیگم‘‘ میں نادر اور جعفری، مراد علی اور جعفر علی ’’شریف زادہ‘‘ میں رقیہ، سکینہ اسی طرح کی متضاد فطرت کے حامل کردار ہیں۔ مرزا رسوا کی کردار نگاری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اہم اور بنیادی کرداروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے اور ضمنی کرداروں کی تصویر کشی میں بھی اپنی فنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ معمولی سے معمولی کردار کی چھوٹی سے چھوٹی خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ رسوا کے کرداروں میں حالات اور ماحول کی تبدیلیوں کے مطابق جیتے جاگتے انسانوں کی طرح ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے۔ کردار نگاری کی یہ تمام خوبیاں مرزا رسوا کی فنی صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔

پلاٹ کی تعمیر و تشکیل اور کردار نگاری کے ضمن میں مرزا رسوا نے جہاں اپنے فنی شعور کا ثبوت دیا ہے وہیں انہوں نے زبان و بیان، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ مرزا رسوا کو زبان و اظہار پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی زبان عام فہم، سلیس اور سشتہ ہے، جس میں شوخی، متانت، بے ساختگی، ادبیت سب کچھ نہایت لطیف ہم آہنگی کے ساتھ شامل ہے۔ زبان کی ان خوبیوں نے رسوا کے بیانیہ میں جان ڈال دی ہے۔ ان کا بیانیہ انداز متوازن اور دلاویز ہوتا ہے۔ کردار نگاری کا ہی ایک اہم جزو مکالمہ نگاری بھی ہے۔ مرزا رسوا مکالمہ نگاری میں بھی فن کاری کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ ان کے مکالمے نہایت چست، وقیع و بلیغ، مختصر اور کردار کی مناسبت سے ہوتے ہیں، جن کے توسط سے رسوا نہ صرف کرداروں کی نفسیات اور جذبات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں بلکہ لکھنوی تہذیب کی پوری فضا کو اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مرزا رسوا کو لکھنؤ کی بیگماتی زبان اور زنانہ لب و لہجہ پر بھی مہارت حاصل تھی۔ منظر نگاری کے میدان میں بھی مرزا رسوا بڑی دسترس رکھتے تھے۔ وہ تمام جزئیات پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں کہ ان کے مختصر سے بیان سے بھی پوری تصویر آنکھوں میں کھینچ آتی ہے، گو یا مرزا رسوا کے ناولوں میں تمام فنی لوازم کی تکمیل بڑے ہی توازن کے ساتھ ہوئی ہے۔

مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا''، ''شریف زادہ''، ''ذات شریف''، ''اختری بیگم'' اور ''افشائے راز'' جیسے معاشرتی ناولوں کی تخلیق کی ہے۔ ان کے اکثر ناول لکھنوی معاشرت کے مختلف طبقوں اور پہلوؤں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ چونکہ رسوا لکھنوی تہذیب و معاشرت کی رگ رگ سے واقف تھے اس لیے انہوں نے اسی ماحول کے پس منظر میں لکھنوی زندگی کے ہر پہلو کی بڑے دل کش اور فن کارانہ انداز میں حقیقی ترجمانی کی ہے۔

رسوا کے ناولوں میں ''امراؤ جان ادا'' ان کا نہ صرف سب سے اہم اور کامیاب ناول ہے بلکہ اردو ناولوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول سہیل بخاری:

> '' امراؤ جان ادا مرزا رسوا کا بہترین ناول اور اردو زبان کا ایک مایہ ناز شاہکار ہے ۵۔''

علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب کا یہ ناول (امراؤ جان) مجموعی حیثیت سے اردو کا شاہکار ہے اور اس پر ہماری زبان جتنا بھی فخر کرے بجا ہے ٦۔''

مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' میں طوائف کی زندگی اور اس طبقے کے گردیدہ لوگوں کا نقشہ بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس کے پس منظر میں لکھنؤ کی اس زوال پذیر معاشرت کی تصویر کشی کی ہے جس میں طوائفوں کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس تمدن میں طوائفیں محض ذہنی یا جسمانی عیاشی کا ذریعہ ہی نہیں تھیں بلکہ وہ پوری زندگی پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کا کوٹھا تہذیب و اخلاق کی آماجگاہ سمجھا جاتا تھا جہاں تہذیب اور خصوصاً آدابِ مجلس سیکھنے کے لیے شرفاء کے بچے بھیجے جاتے تھے اور خود شرفاء کا کوٹھوں پر جانا رئیسوں کی وضع داری میں شامل تھا۔ حالانکہ اب نہ وہ شان و شوکت رہی تھی اور نہ مال و زر۔ لیکن اپنی کھوکھلی شرافت و نجابت اک بھرم رکھنے کے لیے وہ اسی طرح کے جھوٹے سہاروں کو اپنائے ہوئے تھے اور تھوڑی

بہت جو دولت بچ گئی تھی اسے بھی طوائفوں کی نذر کر رہے تھے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے۔"

امراؤ جان ادا" رسوا کے تمام ناولوں میں اس لیے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں رسوا نے نہ صرف لکھنوی معاشرت کی عکاسی تک اپنے کو محدود رکھا ہے بلکہ اس کے کرداروں کے احساسات و جذبات اور ان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے ساتھ ہی واقعات میں جو ترتیب، ربط، تسلسل اور ارتقا ہے وہ بڑا فطری ہے کہیں بھی آورد کی کیفیت نہیں ملتی۔ اس ناول میں رسوا نے انسانی زندگی کے حقیقی اور رومانی پہلو کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے جو ان کے اور ناولوں میں اس حد تک نظر نہیں آتا۔

"امراؤ جان ادا" میں رسوا نے پلاٹ و واقعات کے مقابلے میں کردار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کی کامیابی کا دار و مدار پلاٹ کی چستی اور تنظیم سے زیادہ ماحول کی سچی عکاسی اور فطری کردار نگاری پر ہے۔ "امراؤ جان ادا" میں رسوا نے کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ ہر کردار جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی دنیا کا باشندہ نظر آتا ہے اس ناول کے تمام کردار عام انسانوں جیسی خوبیوں اور خامیوں کے حامل ہیں۔ انہوں نے کسی کردار کو مثالی بنا کے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی انہیں حالات کے اثرات سے بے نیاز رکھا ہے، بلکہ ان کے کردار ماحول اور حالات کے نشیب و فراز سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح حقیقی زندگی گذارنے والے ہوا کرتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں رسوا کی کردار نگاری کا یہ وصف دراصل ان کے گہرے نفسیاتی مطالعے اور ان کی شدید قوت مشاہدہ کی دلیل ہے۔ اس ناول کے نسوانی کرداروں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہر کردار اپنے مزاج و اطوار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان میں موقع اور محل کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسوا کا مقصد محض کرداروں کو نمایاں کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے وسیلے سے زندگی کی حقیقی ترجمانی مقصد تھی اور یہی دراصل رسوا کی فن کاری ہے۔ بقول وقار عظیم:

"امراؤ جان ادا" اردو کا پہلا ناول ہے جس میں زندگی اور فن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ زندگی فن کو راہ دکھاتی ہے اور فن زندگی کو اس کی حدوں میں رکھ کر بھی اسے وہ بلندی دیتا ہے جہاں عام نظر نہیں پہنچتی ہے۔"

مرزا رسوا کا دوسرا قابل توجہ ناول "شریف زادہ" ہے۔ رسوا نے اس ناول میں اس معاشرت کی عکاسی کی ہے جو ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد سماجی اور معاشی زبوں حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ شاہی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی، رقص و سرود کی محفلیں اجڑ چکی تھیں، عوام کے حوصلے پست اور دل مایوس تھے۔ لیکن پھر بھی ماضی کا نشہ اب بھی ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ جدوجہد اور محنت و مشقت کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ گویا رسی جل گئی تھی لیکن بل باقی تھا۔ رسوا نے اس ناول میں بالواسطہ طور پر نہ صرف اس انحطاط پذیر تہذیب کی فرسودہ قدروں کو پیش کیا ہے بلکہ اسے ایک نئی روشنی دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اپنے اس مقصد کی خاطر انہوں نے اس ناول میں ایک ایسے کردار کی زندگی پیش کی ہے جو نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور اپنی محنت سے اپنی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔ اسی مقصدیت کی وجہ سے "شریف زادہ" میں فنی نقطۂ نظر سے کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً واقعات کی ترتیب میں کچھ ڈھیلا پن ہے جو اس کے پلاٹ کو غیر دلچسپ اور میکانکی بنا دیتا ہے۔ اس کے زیادہ تر کردار

بھی بے جان اور مثالی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس ناول کے نسوانی کردار کسی حد تک ہماری دنیا ہی کے باشندے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر فدا حسین کی بیوی جو ایک بد سلیقہ، پھوہڑ، ناخواندہ، رسم و رواج کو مذہب پر فوقیت دینے والی تنگ مزاج اور دقیانوس خیال کی عورت ہے، اس طرح کی عورت کا گھروں میں مل جانا مشکل نہیں۔ عابد حسین کی بیوی کا کردار گرچہ مثالی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آئے۔ اس کے علاوہ رسوآ نے اس ناول میں عابد حسین کے کردار کو بھی مثالی بنا کر پیش کیا ہے جو ایک فنی نقص ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس ناول کی اہمیت اور عظمت اس بنا پر ہے کہ اس میں بدلتے ہوئے سماج میں نوجوانوں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ لکھنوی طرز معاشرت اور سماجی حقائق کی پیش کش بھی بڑے فلسفیانہ اور فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین کا خیال ہے کہ :

"شریف زادہ اگر کچھ اور جاندار ہوتا اور واقعاتی ترتیب کی خشکی اور زاہدانہ تبلیغ ذرا کم ہوتی تو غالباً اردو کا سب سے بڑا ناول ہوتا۸۔"

اپنے تیسرے ناول "ذات شریف" میں رسوآ نے لکھنؤ کے بیمار اور انتشار پذیر سماج کا نقشہ کھینچا ہے اور ان عیوب اور کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے جو اس عظیم الشان تہذیب کی تباہی کا باعث بنیں۔ گویا لکھنؤ کی مٹتی ہوئی سماجی قدریں اور نوابین کے لٹے ہوئے طبقے کی ذہنی، معاشی، اخلاقی اور سماجی پستی "ذات شریف" کا موضوع ہے۔ اس ناول میں رسوآ کی کردار نگاری "شریف زادہ" کے مقابلے میں بہتر ہے۔ اس میں رسوا نے کسی کردار کو مثالی بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ کئی نسوانی کردار بھی اس ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔ مگر ان کے مقابلے میں مردوں کے کردار زیادہ جان دار ہیں۔ کلثوم بیگم، امامن، چھٹی نویس اور مہری وغیرہ اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کلثوم بیگم کے کردار میں رسوآ نے اودھ کی بیگموں کی سچی تصویر پیش کی ہے۔

مرزا رسوآ نے اس ناول میں عمدہ کردار نگاری کے ساتھ ساتھ دوسرے فنی لوازم کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے پلاٹ میں دو مختلف قصوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ کہیں سے بے ربط نظر نہیں آتے اور دونوں کے کردار لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔ خلیفہ، نبی بخش، امامن، امجد، حکیم صاحب، چھٹی نویس، کلثوم بیگم اور نواب دونوں عناصر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سے رسوآ کے فنکارانہ شعور کا پتہ چلتا ہے۔

"اختری بیگم" میں مرزا رسوآ نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی انحطاط پذیر لکھنوی معاشرت اور چند شریف اور معزز خاندانوں کی خانگی الجھنوں کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں اس بات کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اس بیمار تہذیب کے پروردہ کاہل اور مکار ہیں اور جن میں اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت نہیں۔ ناول کا مرکزی کردار اختری بیگم ہے۔ اس کے علاوہ جعفری، نادری، ہرمزی، بوٹن، نواب خورشید مرزا، مراد علی، حسین علی، مہدی حسین وغیرہ کے کردار بھی پیش کیے گئے ہیں، جو اگرچہ اپنے اپنے طور پر فرائض کی انجام دہی میں نظر آتے ہیں، لیکن ان میں وہ فعالیت یا ارتقائی کیفیت نہیں جو رسوآ کی کردار نگاری کا خاصہ ہے۔ گویا اس ناول میں رسوآ کردار نگاری کا نمونہ پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اختری بیگم جو ناول کا بنیادی کردار ہے، رسوآ نے اسے فعال نہیں دکھایا ہے بلکہ اس کردار کی زندگی کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح جعفری کی بدمزاجی

نادری آور ہر مزی کی نیک نفسی، بوٹن کی بد عقلی، مراد علی کی فریب کاری اور مکاری اور نواب خورشید مرزا کی بے اعتنائی اور لا پرواہی کو مبالغے کی حد تک پیش کیا گیا ہے۔

پلاٹ کے لحاظ سے بھی رسوا کا یہ ناول بہت کامیاب نہیں ہے۔ واقعات اور کردار کی کثرت نے اس کے پلاٹ کو غیر متوازن بنادیا ہے۔ غرض کہ ''اختری بیگم'' میں رسوا کی وہ فنی مہارت نظر نہیں آتی جو ''امراؤ جان ادا''، ''شریف زادہ'' اور ''ذات شریف'' میں ملتی ہے۔

''افشاکے راز'' مرزا رسوا کا پہلا اور نامکمل ناول ہے اس میں ذکی کی سیرت کو رسوا نے بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن ناول کا ادھورا پن پلاٹ اور کردار دونوں پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن ناول کا ادھورا پن پلاٹ اور کردار دونوں پر اثر انداز ہوا ہے۔ پلاٹ بالکل سپاٹ اور ڈھیلا ڈھالا ہے۔ کرداروں میں ارتقائی کیفیت مفقود ہے۔ اس ناول میں مرزا رسوا بہ حیثیت ناول نگار وہ نہیں ہیں جو اپنے بعد کے ناولوں میں نظر آتے ہیں۔

ان تمام ناولوں کے جائزے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مرزا رسوا اردو کے وہ پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں کو ہر اعتبار سے فنی اوصاف کا حامل بنایا۔ پلاٹ، کہانی، کردار نگاری، منظر نگاری، فلسفہ حیات، مکالمے اور زبان و بیان کو وہ اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ فن کی تکمیل کے لحاظ سے ان کے ناول ایک روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں اور کسی کسی ناول میں رسوا کے فلسفیانہ مزاج اور علم ریاضی کا روکھا پن در آیا ہے جس سے تھوڑی بے کیفی اور بے رنگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ناولوں کے پلاٹ اور کردار بھی کچھ کمزور نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ مرزا رسوا کا عام انداز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر ناولوں میں بہترین فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس لیے بہ حیثیت مجموعی مرزا رسوا کی ناول نگاری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کو نہ صرف معاشرتی زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان بنایا بلکہ ان کے وسیلے سے فکر و فن کی ایسی روشنی عطا کر دی جس کی شعاعیں آج تک اردو ادب کو منور کر رہی ہیں۔

حواشی

۱۔ مرزا محمد ہادی رسوا — اختری بیگم۔ کراچی، نفیس اکیڈمی۔ (سن اشاعت درج نہیں ہے) ص۔۹۹

۲۔ آل احمد سرور — ناول کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔ ص۔ ۵ بحوالہ: ڈاکٹر آدم شیخ۔ مرزا رسوا: حیات اور ناول نگاری۔ دوسرا ایڈیشن۔ لکھنؤ، نسیم بک ڈپو۔ ۱۹۸۱۔ ص ۳۴۰

۳۔ مرزا محمد ہادی رسوا — ذات شریف۔ لکھنؤ، اشرفی بکڈپی، ۱۹۲۱ء۔ ص ۱۶۲

۴۔ ایضاً — ایضاً ص ۵۴۔

۵۔ سہیل بخاری — اردو ناول نگاری۔ باراول۔ دہلی، الحمرا پبلیشرز۔ ۱۹۷۲ء ص ۷۹

۶۔ علی عباس حسینیؔ ناول کی تاریخ اور تنقید۔ باراول لکھنؤ، انڈین بکڈپو۔(سن اشاعت درج نہیں ہے)ص ۳۳۷
۷۔ وقار عظیمؔ داستان سے افسانے تک۔ علی گڈھ،
مکتبہ الفاظ۔ ۱۹۸۰ء ص ۱۵۵
۸۔ مجتبیٰ حسینؔ اردو ناول کا ارتقا۔ دہلی، پرویز، بک ڈپو۔ ۱۹۷۴ء ص ۱۲۰

***